10

غیر مبایعین کا نامناسب رویہ

(فرمودہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۶ء)

تشہد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

میرا طریق اور مسلک ہمیشہ سے یہی چلا آیا ہے کہ جہاں تک ہو سکے میں بحث سے گریز کرتا ہوں۔ قدرتی طور پر میری طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں مباحثانہ طریق کو ناپسند کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھ سے بحث کے رنگ میں گفتگو شروع کرنا چاہے۔ تو میں اس طریق سے حتی الوسع کنارہ کشی کرتا ہوں۔ ہاں مذہبی بحث اور چیز ہے۔ مذہب کی خاطر اس خیال سے کہ بحث نہ کرنے کی صورت میں اسے نقصان پہنچے گا۔ پورے شوق اور ذوق کے ساتھ بحث میں حصہ لیتا ہوں۔ لیکن دوسرے امور میں مباحثانہ رنگ اختیار کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ اور باوجود اس کے کہ دلیل کا جواب میں دلیل سے دے سکتا ہوں پھر بھی میرا ہمیشہ سے یہی طریق رہا ہے کہ میں بحث سے پہلو تہی کرتے ہوئے معاملہ کو اور صورت میں طے کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً" بسا اوقات جب ہمارے انتظامی معاملات پر آپس میں گفتگو ہو۔ اور دوستوں کے درمیان اختلاف ہو۔ تو میں ایسا طریق اختیار کرتا ہوں کہ سننے والا یہی خیال کرے گا شائد اس کے پاس کوئی دلیل نہیں جس کی وجہ سے یہ اپنے مقام کو چھوڑ رہا ہے اور پیچھے ہٹ رہا ہے۔ مگر میں ہمیشہ یہی چاہتا ہوں کہ بجائے مخاصمانہ رنگ میں گفتگو کرنے کے کوئی ایسا درمیانی طریق نکل آئے جس سے بغیر اس کے کہ کسی قسم کا نقصان پہنچے میں دوسروں کی آراء اور احساسات کو مدنظر رکھ سکوں۔

لیکن اس طریق کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ مخالفین ہمیشہ میری ذات پر طرح طرح کے حملے کرتے رہے ہیں۔ بسا اوقات دوستوں نے چاہا کہ میں بعض معاملات میں دخل دوں اور اپنے مخالفین کے اعتراضات کے جواب دوں۔ لیکن میں حتی الامکان اس خیال سے بچتا رہا کہ جب میری طرف سے

خاموشی ہوگی تو وہ ایسے کمینہ حملوں سے خود ہی باز آ جائیں گے لیکن باوجود اس کے غیر مبایعین کی طرف سے میرے خلاف ہمیشہ مضامین نکلتے رہتے ہیں۔ جن میں وہ مجھ پر ذاتی حملے کرتے رہتے ہیں اور اب وہ اس میں بہت بڑھ گئے ہیں۔

اگر پچھلے چند سال کے میرے خطبات اور مضامین نکال کر دیکھے جائیں۔ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ جس کثرت سے غیر مبایعین نے میرے خلاف لکھا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دسواں حصہ بھی میرے خطبات میں ان کے متعلق نہیں کہا گیا۔

اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ مجھے ان کے اعتراضات پر اطلاع نہیں ہوتی اور نہ میں یہ خیال کر سکتا ہوں کہ کسی کو یہ خیال ہوگا کہ ان کے اعتراضوں کا کوئی جواب ہی نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ ان پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں۔ اعتراض کرنے والے تو لا الہ الا اللہ پر بھی اعتراض کر دیتے ہیں۔ پس اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ غیر مبایعین جو کچھ لکھتے ہیں وہ درست ہوتا ہے تو بھی یہ نہیں خیال کیا جا سکتا کہ ان پر کوئی اعتراض ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی باتیں لا الہ الا اللہ سے تو زیادہ سچی نہیں ہو سکتیں۔ بیشک وہ یہ تو خیال کر سکتے ہیں کہ میں ان کی نظر میں حق سے دور لے جانے والا ہوں۔ لیکن وہ یہ نہیں خیال کر سکتے کہ ان کی باتوں کا کوئی جواب ہی نہیں ہو سکتا۔ جب کہ دنیا میں ہر ایک بات کا جواب دیا جاتا ہے اور سچی سے سچی بات کے جواب میں بھی اعتراض کئے جاتے ہیں۔ پس میری خاموشی اس وجہ سے نہیں کہ میں ان کی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ اور ان پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس طبعی امر کی وجہ سے ہے کہ میں حتی الوسع ذاتیات میں نہیں دخل دینا چاہتا اور ذاتیات کی طرف جانا پسند نہیں کرتا۔

میرے نزدیک دوسرے پر اعتراض کرنے اور دوسرے کی ذات پر حملہ کرنے سے تقویٰ اور بڑائی ثابت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ اپنے اعمال اور افعال سے ثابت ہوتی ہے ہم اگر کسی کو ذلیل سے ذلیل بھی ثابت کر دیں۔ تو اس سے یہ نہیں ثابت ہو جائے گا کہ ہمارے اندر کوئی خوبی ہے۔ اپنی خوبی اپنے کام سے ہی ثابت ہوگی۔ پس نہ تو ہمارے مخالفین کا یہ خیال ہونا چاہئے کہ ہم ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکتے اور نہ ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم پر ناپاک حملے اور اعتراض کر کے وہ اپنی خوبی اور بڑائی کا لوگوں کو قائل کر سکیں گے۔ بے شک وہ اپنی باتوں کو سچا سمجھتے ہوں گے۔ لیکن کم از کم وہ دنیا کے حالات سے اتنے تو ناواقف نہیں ہوں گے کہ دنیا میں ہر ایک بات کا جواب دیا جا سکتا ہے اور دیا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو بے عیب خیال کرتے ہوں گے۔ لیکن ایسے نادان تو نہیں ہو

سکتے کہ وہ یہ خیال کر لیں ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا جبکہ وہ دیکھتے ہیں کہ خدا جیسی بے عیب ذات پر بھی اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے ہیں۔ پس جب خدا پر اور اس خدا پر جسے اسلام پیش کرتا ہے اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے ہیں۔ تو وہ کس طرح خیال کر سکتے ہیں کہ وہ خدا سے بھی بڑھ کر بے عیب ہیں کہ ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

پس اگر ذرا بھی وہ عقل سے کام لیتے تو سمجھ سکتے تھے کہ میں جو ان کے مقابل اکثر خاموش رہتا ہوں۔ تو میری اس خاموشی کی وجہ یہ نہیں کہ میں ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دے سکتا اور میرے پاس دلائل نہیں۔ پھر وہ یہ بھی خیال کر سکتے تھے کہ ان کی ذات اس قدر بے عیب نہیں کہ ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میری خاموشی کی وجہ میرا طبعی میلان ہے۔ اور اسی وجہ سے اپنے دوستوں کو بھی اخباروں میں ذاتیات میں پڑنے سے روکتا رہتا ہوں۔ خود میں نے کبھی ذاتیات پر بحث نہیں کی۔ اور سوائے شاذ و نادر کے ان کے ایسے اعتراضوں کے جواب نہیں دیئے۔ اور جو دیئے - وہ بھی اس وقت جبکہ بعض لوگوں کے ایمان کا خطرہ تھا۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ شرافت سے اس قدر عاری ہو جاتے ہیں کہ خاموشی کو شکست اور نرمی کو بزدلی اور عفو کو کمزوری خیال کر لیتے ہیں۔ جب وہ مقابل سے خاموشی دیکھتے ہیں۔ یہی روش غیر مبایعین نے اختیار کر رکھی ہے۔ وہ روز بروز ایسے حملوں میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ پچھلے دو سال میں ایک سطر یا ایک اشارہ بھی میرے خطبات میں سے کسی غیر مبایع کے متعلق ایسا نہیں دکھا سکتے۔ جس میں کسی قسم کا حملہ کیا گیا ہو۔ ایسی حالت میں ان کے برابر بڑھتے چلے جانے کی وجہ یہی ہے کہ ان کے ذاتی اعتراضات کا ہماری طرف سے جواب نہیں دیا جاتا۔

بعض دفعہ ان کے معززین جب ملے ہیں۔ تو انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے پر اعتراضات نہ کئے جائیں۔ اور باہمی صلح کر لی جائے۔ کیونکہ اعتراضات سے سلسلہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے متعلق میں نے ہمیشہ آمادگی ظاہر کی ہے۔ لیکن ان کی یہ خواہش کبھی سچی ثابت نہیں ہوئی۔ یہی دیکھ لو گذشتہ ڈیڑھ دو سال میں ایک خطبہ بلکہ کسی خطبہ میں کوئی فقرہ بھی ان کے خلاف میرے منہ سے نہیں نکلا۔ لیکن اس کے مقابل ان کے پریذیڈنٹ اور ان کے امیر نے اپنے کئی خطبات اور تقریروں میں مجھ پر ذاتی حملے کئے ہیں۔ اب ایک طرف ان کے امیر کا اس طرح غیر شریفانہ اعتراضات کرنا۔ اور دوسری طرف یہ کہنا کہ آؤ صلح کر لیں۔ ذاتی اعتراضات سے بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ یہ ان کی نیتوں اور ارادوں پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔ بھلا اس طرح بھی کبھی صلح ہو سکتی

ہے۔

صلح دل کی اصلاح کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ دیکھو مسٹر گاندھی نے دلوں کو درست کئے بغیر ہندو مسلمانوں کی صلح کرانی چاہی۔ سال بھر تک تو آپس میں اس قدر صلح نظر آتی تھی کہ سگے بھائیوں سے زیادہ محبت معلوم ہوتی تھی مگر اس کے بعد پھر مخالف اثر پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور ایسا اثر ہوا کہ آج سے بیس سال پہلے مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات اتنے خراب نہیں تھے۔ جتنے اس صلح اور اتحاد کے بعد ہو گئے ہیں جو مسٹر گاندھی نے کرائی تھی۔ اور جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ وہ ٹوٹی اور ایسی ٹوٹی کہ پہلے سے بھی بدتر حالت ہو گئی۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ بغیر دلوں کی اصلاح کئے صلح کی کوشش کی گئی مگر قوموں کی صلح ہمیشہ اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ جب ان کے دل اس بات کو محسوس کریں کہ ذاتیات پر بلاوجہ بیہودہ اعتراضات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اگر اس بات کو دل محسوس نہ کریں تو لاکھ مہریں اور دستخط ہوں۔ اور لاکھ شرائط طے کئے جائیں۔ صلح کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔

پھر قوموں میں صلح بڑوں کے صلح کر لینے سے اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی۔ جب تک قوم کے افراد میں سے صلح کے موانع دور نہ کئے جائیں۔ وہ اقوام جن میں صلح کے مواقع پیدا ہوتے رہیں۔ ان کے افراد میں کبھی صحیح صلح نہیں ہو سکتی۔

پھر تمام طبائع ایک سی نہیں ہوتیں۔ بعض طبائع جوشیلی ہوتی ہیں۔ بعض متحمل اور نرم ہوتی ہیں جو دوسروں کی سختی برداشت کر لیتی ہیں۔ لیکن بعض طبائع برداشت نہیں کر سکتیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ایک مخلص دوست پروفیسر کے نام سے مشہور تھے۔ وہ حضرت صاحب کے خلاف کوئی بات سن کر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ خواجہ کمال الدین صاحب نے حضرت صاحب کی خدمت میں ان کے متعلق شکایت کی کہ یہ لوگوں سے بڑی سختی سے پیش آتے ہیں۔ ان کو نرمی اور صبر کی نصیحت کی جائے۔ حضرت صاحب نے انہیں بلا کر نصیحت شروع کی کہ آپ سختی چھوڑ دیں۔ اگر کوئی ہمیں برا بھلا کہے تو صبر کیا کریں۔ ایسے موقعہ پر اسلام صبر کی تعلیم دیتا ہے۔ پہلے تو وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ جب حضرت صاحب خاموش ہو گئے تو بڑے جوش سے کہنے لگے۔ آپ ہمیں تو صبر کی تعلیم دیتے ہیں۔ لیکن جب آپ کے پیر (محمد رسول اللہ ﷺ) کو کوئی گالی دیتا ہے۔ تو مباہلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ تو طبائع مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔

اب اگر ایک جماعت دیکھتی ہے کہ اس کے امام کو بلاوجہ گالیاں دی جاتی ہیں۔ اور اس پر بے جا

اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ تو وہ کب تک برداشت کرتی جائے گی۔ بہت سے لوگ ہوں گے جو قتل ہو جانا برداشت کر لیں گے۔ لیکن یہ برداشت نہیں کریں گے کہ ان کے امام پر بے ہودہ اعتراضات کئے جائیں اور اسے برا بھلا کہا جائے۔ میں پوچھتا ہوں۔ اگر واقعہ میں غیر مبایعین صلح کے خواہشمند ہیں اور نیک نیتی سے ایک دوسرے کے خلاف لکھنا بند کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہماری طرف سے خاموشی اختیار کرنے پر وہ مجھ پر بلاوجہ اعتراض پر اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں۔

پیچھے ایک دفعہ ڈلہوزی میں ان میں سے ایک شخص مجھے ملنے آئے۔ ان کے والد پہلے تو غیر مبائع تھے لیکن بعد میں انہوں نے میری بیعت کر لی اور مخلص ہیں۔ وہ کہنے لگے۔ آپ مولوی محمد علی صاحب سے صلح کر لیں۔ اس کا نیک نتیجہ پیدا ہوگا۔ اور مولوی محمد علی صاحب کہتے ہیں کہ میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ قبول کر لیں۔ میں نے کہا آپ میری بات بھی سن لیں۔ اور پھر اندازہ لگائیں کہ میں کیونکر دعوت قبول کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا حضرت خلیفہ اول کی وفات کے بعد جب میں لاہور آیا۔ تو میں نے ایک دوست کے ذریعہ اس خیال سے کہ بعض دفعہ ملاقات کرنے سے ایک دوسرے سے نفرت دور ہو جاتی ہے۔ یہ تجویز کی کہ مولوی محمد علی صاحب کی دعوت کی جائے۔ چنانچہ اس دوست نے دعوت کی۔ لیکن مولوی محمد علی صاحب نے بجائے دعوت منظور کرنے کے یہ کہا کہ پہلے مباحثہ ہونا چاہئے۔ اب دیکھئے میں نے تو یہ تجویز کی لیکن ادھر مولوی صاحب نے دعوت کا انکار کرتے ہوئے مباحثہ کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ جس کے لئے بعد میں شرائط وغیرہ بھی پیش ہوتی رہیں۔ اور آخر وہ مباحثہ کی طرف بھی نہ آئے۔ پھر ایک دفعہ عبدالحی مرحوم کی وفات پر مولوی محمد علی صاحب اور ڈاکٹر یعقوب بیگ صاحب وغیرہ یہاں آئے۔ تو میں نے دعوت کے لئے پیغام بھیجا۔ لیکن اس وقت بھی انہوں نے دعوت سے انکار کر دیا۔

پھر ایک دفعہ یہاں شیخ رحمت اللہ صاحب آئے۔ اور بہشتی مقبرہ میں گئے۔ تو میں نے قاضی امیر حسین صاحب کے ذریعہ وہیں انہیں دعوت کا پیغام بھیجا۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اور پھر میں خود ان کے پاس پہنچا۔ اور وہیں چائے منگا کر ان کو پلائی اور ٹھیرنے کے لئے بھی کہا۔ لیکن وہ ٹھیر نہ سکے۔ پھر یہ لوگ مولوی محمد احسن صاحب کے لئے یہاں آئے تو میں نے دعوت کا پیغام بھیجا۔ لیکن انہوں نے دعوت رد کر دی میں نے مولوی شیر علی صاحب کے ہاتھ ٹانگہ پر کھانا بھجوایا کہ بٹالہ اتر کر کھا لینا۔ لیکن انہوں نے ٹانگہ میں برتن رکھے ہوئے اتار دیئے۔ ان واقعات کے بعد بتائیے۔ غیرت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ اور ان حالات میں میں ان کی دعوت کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔ اس پر اس دوست نے

کہا۔ پھر آپ دعوت کریں۔ مولوی صاحب آ جائیں گے۔ میں نے کہا یہ ٹھیک ہے لیکن یہ موقعہ دعوت کے لئے مناسب نہیں۔ کیونکہ یہاں نہ تو ہمارے پاس برتن کھانا پکانے کے لئے ہیں اور نہ آدمی کھانا پکانے والا ہے۔ اس لئے پھر کسی موقعہ پر دعوت ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد وہ دوست چلے گئے اور مولوی صاحب سے یہ باتیں کہہ دیں۔ میں جب یہاں واپس آیا۔ تو آتے ہی میں نے اپنے اخباروں کے ایڈیٹروں کو سمجھا دیا کہ اب ان کے خلاف کوئی بات نہ لکھی جائے لیکن ادھر تو میرا یہ رویہ تھا کہ میں نے یہاں پہنچتے ہی اخباروں کے ایڈیٹروں کو ان کے خلاف لکھنے سے منع کر دیا اور ادھر اسی سفر کے متعلق ڈاکٹر بشارت احمد صاحب کی طرف سے پیغام میں ایک مضمون نکلا۔ جس میں لکھا گیا کہ معلوم ہوتا ہے اب میاں صاحب کی آمدنی کم ہو گئی ہے اور ان کی جماعت ان کی فضول خرچیوں سے تنگ آ گئی ہے۔ کیونکہ اب سفر ڈلہوزی میں ان کے ساتھ شان و شوکت نہ تھی۔ بہت سادگی کے ساتھ انہوں نے یہ سفر کیا۔

اب دیکھئے ادھر تو صلح کے لئے بات چیت کی جاتی ہے اور میں واپس آ کر اخبار والوں کو ان کے خلاف قلم اٹھانے سے روکتا ہوں۔ اور ادھر میرے اسی سفر کے متعلق لکھا جاتا ہے کہ اب معلوم ہوتا ہے۔ میاں صاحب کو ان کی جماعت روپیہ نہیں دیتی۔ اور ان کی فضول خرچیوں سے تنگ آ گئی ہے اور جماعت میاں صاحب سے متنفر ہو رہی ہے۔ کیونکہ اب کی دفعہ میاں صاحب کے ساتھ شان و شوکت نہیں تھی۔ اس وقت میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا۔ بعض طبائع میں نیش زنی کی عادت ہوتی ہے۔ شریف آدمی جو تعصب سے خالی ہو۔ وہ خود ہی ان کی تحریر سے اندازہ لگالے گا کہ ان کا دل شرافت سے خالی ہو چکا ہے۔

یہ مضمون ان کے کسی بچہ یا نوجوان کا نہیں تھا۔ بلکہ ڈاکٹر بشارت احمد صاحب کا تھا جو مولوی محمد علی صاحب کے خسر ہیں اور جن کو ان کی جماعت میں خاص اعزاز حاصل ہے۔

اب ان سے کوئی پوچھے۔ ہماری کون سی بات ہو گی جس پر تم اعتراض نہیں کرو گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے دل شرافت سے خالی ہو چکے ہوں اور جائز و ناجائز مخالفت کی کوئی پروا نہ کریں وہ ہر بات پر اعتراض کر سکتے اور کرتے ہیں۔ دیکھو حضرت مسیح علیہ السلام جب دنیا میں آئے تو دشمنوں نے ان پر یہ اعتراض کیا کہ اگر یہ سچا ہے تو اس کے ساتھ فوجیں کیوں نہیں مگر جب محمد رسول اللہ ﷺ فوجوں کے ساتھ آئے تو کہہ دیا کہ یہ خونریزی کرتا ہے۔ اگر سچا ہے تو فوجیں اس کے ساتھ کیوں ہیں۔ اسی طرح ہماری حالت ہے۔ اگر ہمارے ساتھ سفر میں جماعت کے کچھ آدمی

ہوں تو غیر مبایعین شور مچا دیتے ہیں۔ کہ اتنا خرچ کرکے جماعت کا مال تباہ کر دیا اور اگر ساتھ نہ لے جاؤں تو پھر کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ میاں صاحب سے جماعت تنگ آ گئی ہے۔ کیونکہ ان کے ساتھ شان و شوکت نہیں۔

میں کہتا ہوں بھلے مانسو! مجھے اس کے سوا تم ہی کوئی طریق بتاؤ کہ نہ تو میرے ساتھ سفر میں آدمی جائیں اور نہ میں بغیر آدمیوں کے جاؤں۔ اگر آدمی جاتے ہیں۔ تو اس کے یہ معنے لئے جاتے ہیں کہ میں شہرت اور شوکت چاہتا ہوں اور جماعت کا روپیہ برباد کرتا ہوں اور اگر نہ لے جاؤں تو پھر اعتراض ہوتا ہے کہ جماعت میں میرے خلاف ایک جوش پیدا ہو گیا ہے۔ پیچھے جب میں ولایت گیا تو شور مچا دیا کہ بھلا بارہ تیرہ آدمیوں کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس طرح قوم کا روپیہ برباد کیا گیا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں مہربانی کرکے مجھے بتائیے۔ میں وہ کون سا طریق اختیار کروں کہ جب میں کسی سفر پر جاؤں تو میرے ساتھ اور آدمی جائیں بھی اور نہ بھی جائیں۔ یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے پنڈت دیانند نے انجیل پر ایک یہ اعتراض کیا۔ ہے کہ انجیل میں آتا ہے خدا سب دنیا کی دعائیں سنتا ہے۔ اور زمین گول ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ خدا رات دن دعائیں ہی سنتا رہتا ہے۔ پھر کیا رات دن یہ کام کرنے سے تھکتا نہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ نہ تھکے اور بائبل میں لکھا ہے خدا نے زمین و آسمان پیدا کرنے کے بعد آرام کیا۔ اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ وہ خدا کیسا ہوا جو تھک جائے۔ یہی طریق غیر مبایعین کا ہے۔

میں کہتا ہوں اگر مولوی محمد علی صاحب وغیرہ کی تحریریں صلح کے متعلق واقعی سچائی اور دیانتداری پر مبنی ہوتیں۔ تو وہ بھی میری طرح ہی اپنے اخبار والوں کو ذاتیات پر بے ہودہ اعتراضات کرنے سے روک دیتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور ان کا ایسا نہ کرنا بتاتا ہے کہ وہ صلح کے لئے کہنے کے لئے تو بہت کچھ تیار ہیں۔ لیکن کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔

مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میری ذات پر اعتراضات کرنے سے کون سا مذہبی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ آیا میرے اپنے ساتھ سفر میں آدمی لے جانے یا نہ لے جانے کی بحث نبوت کا مسئلہ حل جاتا ہے۔ یا خلافت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ کون سا مذہبی مسئلہ ایسی باتوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ میں اگر اپنی جماعت کا مال کھاتا ہوں۔ تو میری جماعت کا حق ہے کہ مجھ پر اعتراض کرے۔ اور اگر نہیں کھاتا تو بھی میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ ان لوگوں کو ہمارے ان معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔

میں تو مالی معاملات میں اس قدر احتیاط کرتا ہوں کہ جو روپیہ آتا ہے۔ میں اسے ہاتھ بھی نہیں

لگاتا۔ میرا اپنا روپیہ بھی دفتر میں سے ہو کر آتا ہے تاکہ کسی کو شبہ نہ پیدا ہو۔ مگر بہرحال کچھ بھی ہو ان کا کوئی حق نہیں کہ میرے معاملات میں دخل دیں اور مجھ پر اعتراض کریں۔

پھر ان کو یہ بھی خیال کرنا چاہئے۔ کیا ہم اس قسم کے اعتراضات مولوی محمد علی صاحب پر نہیں کر سکتے۔ کیا ہمارے پاس قلمیں نہیں ہیں۔ لیکن باوجود اس کے کہ وہ شیشہ کے مکان میں بیٹھ کر ہم پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہم ان کے مقابلہ میں اس قسم کی روش اختیار نہیں کرتے۔ جو ہماری شرافت پر دلالت کرتا ہے۔ مولوی محمد علی صاحب مجھ سے زیادہ سفر بھی کرتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ کبھی اکیلے سفر کرتے ہیں۔ مگر ہم نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں ہمیں کیا ضرورت ہے۔ اعتراض کریں۔ وہ کہیں جائیں یا نہ جائیں۔ اکیلے جائیں یا آدمیوں کو ساتھ لے کر جائیں ہمیں کیا۔ لیکن باوجود ہمارے اس رویہ کے ان کی طرف سے ذاتی اعتراضات کا سلسلہ برابر چلا جاتا ہے۔

اب میری شادی کا ہی معاملہ ہے۔ اس میں مجھ پر اعتراض کئے جا رہے ہیں۔ ہم اگر ان کی شادیوں کے متعلق لکھیں۔ تو ان کی بہت زیادہ ہتک ہو سکتی ہے۔ لیکن میں اس طریق کو کمینگی سمجھتا ہوں اس لئے اس میں میں ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ مگر انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے بھی موجود ہیں۔ پھر میں ان سے پوچھتا ہوں۔ میری شادی کون سی خلاف شریعت ہے۔ باقی رہیں شادی کی وجوہات۔ میں کہتا ہوں رسول کریم ﷺ کی نو شادیوں کے متعلق جو وجوہات وہ بیان کریں گے۔ وہی وجوہات خدا کے فضل سے اپنی شادی کی میں بیان کر سکتا ہوں۔ ایسی حالت میں میں پوچھتا ہوں۔ کیوں نہیں تم محمد رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کرتے اور کیوں نہیں تم صحابہؓ پر اعتراض کرتے؟ کیونکہ انہوں نے بھی ایک سے زیادہ نکاح کئے۔ کیا تم اسی لئے اعتراض نہیں کرتے کہ تمہارے محمد رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کرنے سے ساری دنیا تمہارے پیچھے پڑ جائے گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تم میری آڑ میں محمد رسول اللہ پر اعتراض کر رہے ہو۔ پھر چاروں خلفاء کی شادیوں کی وجوہات بیان کرو۔ کیونکہ چاروں نے ایک سے زیادہ بیویاں کیں۔

رسول کریم ﷺ کے متعلق اگر نرینہ اولاد کی وجہ بیان کرو۔ تو یہ وجہ بھی درست نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ کو خدا نے پہلے ہی **ما کان محمدا ابا احد من رجالکم (الاحزاب ۴۱)** میں خبر دے دی تھی کہ آپ کے ہاں اولاد نرینہ نہیں ہو گی۔ لیکن اس کے بعد بھی آپ نے نکاح کئے۔ پھر اگر کہو دین سکھانے کے لئے شادیاں کیں۔ تو حضرت عائشہ کے متعلق آپ فرما چکے تھے کہ

نصف دین ان کے ذریعہ مسلمانوں کو حاصل ہوگا۔ پس اگر حضرت نبی کریم ﷺ اور آپ کے خلفاء نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں اور تم ان پر اعتراض نہیں کرتے۔ حالانکہ تم ان کی وجوہ بھی نہیں جانتے۔ تو کیا وجہ ہے کہ تم مجھ پر اعتراض کرتے ہو۔ ہاں اگر وہ گالیاں جو مجھے دیتے ہو۔ ویسی ہی ان کو بھی دو اور جو اعتراض مجھ پر کرتے ہو وہی ان پر بھی کرو۔ تب میں سمجھوں گا کہ تم نے دیانت داری سے مجھ پر اعتراض کیا ہے۔ اب یا تو ان پر بھی ہاتھ صاف کرو یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ مجھ پر دیانتداری سے اعتراض نہیں کئے جا رہے بلکہ شرارتاً کئے جا رہے ہیں۔

باقی رہا میری صحت کا معاملہ۔ تم کہتے ہو میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ میں نکاح کروں۔ میری صحت تو بچپن سے ہی خراب ہے۔ اس لحاظ سے تو میری پہلی شادی بھی نہیں ہونی چاہئے تھی۔ بچپن میں میری صحت خراب تھی اسی وجہ سے حضرت صاحب نے حساب کی تعلیم مجھ سے چھڑا دی تھی۔ پھر محض شادی سے صحت نہیں بگڑ جایا کرتی۔ اگر انسان صحت کے اصول کا خیال رکھے اور احتیاط کرے تو دس شادیوں کے ساتھ بھی صحت نہیں بگڑتی۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ میری صحت کے متعلق آپ لوگوں کو کب سے فکر پیدا ہوا ہے۔ اس رنگ میں اعتراض کرنا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ یہ محض ایک بہانہ ہے۔ اور اصل مقصد اعتراض کرنا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک عورت کو جس کی ایک آنکھ تھی ایک شخص جب سلام کہتا تو وہ اس پر برا مناتی۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگی یہ مجھے سلام نہیں کہتا بلکہ کہتا ہے کہ بھابی کانی سلام۔ اس کا سلام کرنا مجھے چھیڑنے کے لئے ایک بہانہ ہے۔ اسی طرح ان کے نزدیک میرا شادی کرنا ایک عیب ہے۔ جو مجھ پر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر کہتے یہ ہیں دیکھو جی۔ میاں صاحب کی صحت خراب ہے۔ گویا یہ ایک آڑ ہے جس کے پیچھے مجھ پر اعتراض کرنا چاہتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں میری صحت کی فکر ان کو کب سے ہوئی میری صحت کی فکر تو مجھے ہو سکتی ہے یا میرے عزیزوں اور میری جماعت کو ہو سکتی ہے۔ ان کو میری صحت کی کیا پرواہ ہے۔ ان کے نزدیک تو میں گمراہ کرنے والا ہوں۔ دراصل وہ ایک بہانہ سے اعتراض کرنا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ اگر ایک سے زیادہ نکاح کرنا برائی ہے۔ تو یہ برائی تمہیں اوروں میں کیوں نظر نہیں آتی۔ اکثر صوفیاء نے ایک سے زیادہ شادیاں کی ہیں۔ پھر عشرہ مبشرہ صحابہ میں سے کوئی ہی ہوگا۔ جس نے ایک سے زیادہ نکاح نہ کئے ہوں۔

دراصل غیر مبایعین کے اس قسم کے اعتراض نیش عقرب کے مصداق ہیں۔ جن سے سوائے ہمیں دکھ پہنچانے کے اور کوئی فائدہ نہیں۔ اور نہ کوئی ان سے مذہبی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ ہم سے

گفتگو کرو حضرت مسیح موعود کی نبوت کے متعلق ہم سے پوچھو۔ نظام سلسلہ کے متعلق ہم سے سوال کرو۔ حضرت مسیح موعود کے درجہ کے متعلق۔ آپ کی تعلیم کے متعلق۔ یہ باتیں ہیں جن کے متعلق ہم سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ شادیوں سے ان مسائل کو کیا تعلق؟

بلاوجہ مجھ پر اعتراض کرنے سے وہ لوگ جن کو مجھ سے محبت ہے۔ وہ تم سے کیسے صلح کر سکتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود نے آریوں کے حضرت نبی کریم ﷺ کی ذات پر بے ہودہ اعتراضات کے جواب میں پیغام صلح میں لکھا ہے کہ ہماری جنگل کے درندوں اور شور زمین کے سانپوں سے صلح ہو سکتی ہے۔ لیکن اس قوم سے صلح نہیں ہو سکتی جو آنحضرت ﷺ کی ذات پر حملے کرنے۔ یہی جواب مجھ سے محبت رکھنے والے غیر مبایعین کو دیں گے۔ کہ ایسی حالت میں جبکہ تم ہمارے امام پر ناپاک اور گندے اعتراض کرتے ہو۔ ہم جنگل کے درندوں سے اور شور زمین کے سانپوں سے صلح کر سکتے ہیں۔ مگر تم سے صلح نہیں ہو سکتی۔ اگر تمھاری صلح کی نیت ہے تو صلح والے کام بھی کرو۔

اگر وہ ایسے اعتراضات اور نیش زنیوں سے باز نہیں آئیں گے تو پھر میں بھی اپنے آدمیوں کو جو ان کے مقابل لکھنا جانتے ہیں۔ لکھنے کی اجازت دے دوں گا۔ حضرت خلیفہ اول نے ایک دفعہ ان لوگوں کو فرمایا تھا۔ جو آپ پر جماعت میں سے اعتراض کرتے رہتے تھے کہ یاد رکھو میرے پاس ایسے خالد ہیں جو تمھیں سیدھا کر دیں گے۔ میں بھی کہتا ہوں کہ میرے پاس بھی خالد موجود ہیں۔ جنہیں میں نے اس وقت تک روکا ہوا ہے۔ جب وہ میری ذات پر اعتراضات سنتے ہیں۔ اور میں انہیں جواب دینے سے روکتا ہوں۔ تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ ان کے پاس ایسے ایسے جواب ہیں کہ جن کے لکھنے کے بعد اعتراض کرنے والوں کو شرم کے مارے منہ چھپانے کی بھی جگہ نہیں ملے گی۔ ایسی صورت میں ہمارا جواب سے خاموش رہنا ہماری شرافت پر دلالت کرتا ہے۔ اور ان کا ہم پر اعتراضات کرتے جانا ان کے کمینہ پن کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اب جب کہ وہ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ اگر ہماری طرف سے انہیں جواب دئے گئے۔ تو پھر ہم پر کسی کو گلہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے پاس ایسے لکھنے والے موجود ہیں۔ جن کے جوابات سے پہلے ایک دفعہ وہ چلا اٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اب بھی قلمیں موجود ہیں اور واقعات بھی پہلے سے زیادہ موجود ہیں پھر ان کے لئے جواب میں لکھنا کیا مشکل ہے۔ مگر میں پھر کہتا ہوں۔ کیا حقیقت ہے ان پرزوں کی جو صلح کے متعلق لکھے گئے اور ان تجویزوں کی جو صلح کے لئے کی گئیں۔ جب دماغ دشمنی کے خیالات اور افکار سے پراگندہ ہیں تو پھر قلم کی تحریروں اور منہ کی باتوں پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔

میں اب بھی انہیں کہتا ہوں۔ اپنے رویہ کو بدلو۔ شرافت سے کام لو۔ اور مذہبی مسائل پر جتنا چاہو لکھو ایسی باتوں میں نہ پڑھو جن کا نتیجہ سوائے رنجش اور بدمزگی کے اور کچھ نہیں نکل سکتا۔ میں پوچھتا ہوں۔ بھلا شادی کرنا مذہبی طور پر کون سا ایسا مسئلہ ہے۔ جن پر وہ متواتر ہمیں اعتراضات کا نشانہ بنا رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں اگر ہم بلاوجہ بھی شادی کریں۔ بشرطیکہ ہم عدل و انصاف تمدنی و سیاسی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے شادی کریں۔ تو بھی ہم پر شرعاً" کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اگر ملکی تمدنی شرعی حالات اجازت دیتے ہوں اور کوئی وجہ نہ ہو تب بھی شادی جائز ہے اور اگر کوئی شخص صرف اسی نیت سے زیادہ شادیاں کرے کہ اولاد زیادہ ہو تو بھی جائز ہے۔ ہاں اگر تمدنی و قومی یا شرعی حالات کسی کو زیادہ شادیوں کی اجازت نہ دیتے ہوں تو پھر اس شخص کے لئے جائز نہیں۔ خواہ اسے ضرورت بھی ہو۔

میں نے یہ شادی خوابوں کی بناء پر کی۔ اگر وہ کہیں کہ خواب دوسروں کے لئے کیسے حجت ہو سکتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ رؤیا کا اعتبار یا عدم اعتبار تو میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ کیونکہ رؤیا کا تعلق میری ذات سے ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ میری رؤیا کیا عظمت رکھتی ہے۔ اور وہ قابل عمل ہے یا نہیں اور کس طرح اس پر عمل کرنا چاہئے۔ دشمن کا کسی بات کو ماننا یا نہ ماننا اس امر کی سچائی کی دلیل نہیں ہوا کرتی۔ سچائی اپنی ذات میں سچائی ہوتی ہے۔

میری تو یہ حالت ہے کہ میں اپنے ذاتی معاملات میں بھی دوستوں سے مشورہ لے لیا کرتا ہوں۔ حالانکہ قومی اور مذہبی طور پر مجھ پر اپنے ذاتی معاملات میں دوسروں سے مشورہ لینا فرض نہیں اور اسی وجہ سے بعض دوستوں نے مجھے کہا بھی ہے کہ آپ خواہ مخواہ کیوں دوسروں کو اپنے معاملات میں دخل دینے کا موقعہ دیتے ہیں۔ کسی کا حق نہیں کہ آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دے۔ لیکن میرا اپنا یہی دستور ہے کہ میں اکثر مشورہ لیتا ہوں۔ کیونکہ مشورہ سے آخر کوئی نہ کوئی ایسی مفید بات نکل آتی ہے جو پہلے معلوم نہیں ہوتی۔ پیچھے جب میں نے ولایت جانے کے لئے جماعت سے مشورہ لیا تو میں نے دیکھا کہ بالکل ان پڑھ لوگوں کے منہ سے ایسی ایسی باتیں نکلتی تھیں۔ جن کے سننے سے لطف آ جاتا تھا۔ اور بعض باتیں بڑے بڑے آدمیوں کے ذہن میں نہیں آئی تھیں جو دوسرے آدمیوں کے منہ سے نکلیں۔

پس میں ان لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اپنی قلموں کو روکیں اور اپنے رویہ کو بدل لیں۔

کیونکہ جب کوئی حد سے بڑھ جاتا ہے۔ تو پھر اس کا جواب دینے کی ضرورت آ پڑتی ہے۔ جب یہ خطرہ ہو کہ دوسروں کو ٹھوکر لگے گی۔ اور لوگوں کے ایمان میں نقص واقع ہوگا۔ تو اس وقت مجبوراً جواب دینا پڑتا ہے۔

اب اگر انہوں نے اپنے رویہ کو نہ بدلا۔ اور یہی طرز جاری رکھی جو اب اختیار کر رکھی ہے۔ تو پھر میں بھی اپنے دوستوں کو ان کے مقابل قلم اٹھانے کی اجازت دے دوں گا اور اس کی ذمہ داری ان معترضین کی گردنوں پر ہوگی۔ کیونکہ ان جوابوں کے موجب وہی لوگ ہوں گے۔

بالآخر میں خود بھی دعا کرتا ہوں۔ اور اپنے دوستوں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ان لوگوں کے لئے دعا کریں۔ میں تو ہمیشہ ان کی خیرخواہی کرتا ہوں۔ ان میں سے کوئی مرجاتا ہے تو مجھے اس پر رحم ہی آتا ہے۔ کیونکہ معلوم نہیں۔ مخالفت کی وجہ سے اسے کیا نقصان پہنچے گا یا اس کے درجات میں ترقی نہیں ہوگی۔ دیکھو آخر یہ لوگ انہی میں سے تھے۔ جو حضرت صاحب کی خدمت میں بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن ایک ٹھوکر سے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ بات یہ ہے۔ شیشہ کے برتن کی حفاظت زیادہ آسان ہے۔ بہ نسبت ایمان کے۔ پس تم لوگ ہمیشہ اپنے تقویٰ اور ایمان کی حفاظت کرو اور دوسروں کے لئے دعا کرتے رہو۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ایمانوں کو سلامت رکھے۔ اور ہر ایک قسم کی ٹھوکر سے بچائے۔ اسی کی طرف ہماری نظر ہو اور اسی کی طرف ہماری ایسی توجہ ہو کہ اسے کوئی دشمن نہ پھیر سکے۔ آمین

(الفضل ۲۳ مارچ ۱۹۲۶ء)